رسائل و مسائل

لونڈیوں سے تمتع

"اکثر علماء لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع کے جواز میں آیت اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ پیش کرتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

ا لونڈیوں سے بلا نکاح تمتع محض شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے بفحوائے مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ۔

ب۔ اگر ملکیت سے مالک کو حق وطی حاصل ہے تو ایک غلام کی مالکہ جو غیر شادی شدہ ہو اس سے کیوں محروم رکھی جائے؟ وہ ضبطِ نسل کو روکنے کے لیے مانعاتِ حمل استعمال کرسکتی ہے۔

ج۔ غیر مسلم محارب قومیں اگر مسلمات ماخوذہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو عقلاً اس کے خلاف مسلمانوں کو احتجاج کا کیا حق ہے؟

د۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور بے لوث زندگی بالخصوص عالم شباب میں خانگی زندگی کی بہترین مثال ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ آخری عمر میں جب کہ متعدد ازواج مطہرات موجود تھیں آپ نے بھی لونڈیوں سے تمتع کیا؟

ہ۔ اگر ملکیت سے حق وطی حاصل ہوتا ہے تو فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ۔ کی صورت میں کیا لونڈی پر دوگونہ حق ہوگا؟ ایک خاوند کو بلحاظ نکاح اور دوسرے مالک کو بلحاظ ملکیت۔ اگر نہیں تو کیوں؟"

ترجمان القرآن ۔ ملک یمین کی بنا پر تمتع کی اجازت قرآن مجید کی متعدد آیات میں وارد ہوئی ہے۔ سورۂ نساء رکوع اول میں ہے:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔

اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد بیویوں کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا جو لونڈی تمہارے قبضہ میں ہو۔

اسی سورہ کے چوتھے رکوع میں ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور حرام کی گئیں بیاہی ہوئی عورتیں مگر وہ جو لڑائی میں تمہارے ہاتھ آئی ہوں۔

سورہ مومنون کے پہلے رکوع میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ

اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کے مال یعنے لونڈیوں کے کہ اس میں ان پر کچھ ملامت نہیں۔

سورہ احزاب کے چھٹے رکوع میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ

اے نبیؐ ہم نے تمہارے لیے تمہاری بیویوں کو حلال کر دیا جن کے مہر تم نے ادا کر دیے ہیں اور ان لونڈیوں کو بھی جو ان عورتوں میں سے تمہارے قبضہ میں ہیں جنھیں اللہ نے تم کو غنیمت میں عطا فرمایا ہے۔

پھر فرمایا:۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ۔

اب اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں نہ یہ کہ ان کے بدلے میں تم دوسری بیویاں کر لو خواہ ان کا حسن تم کو کتنا ہی پسند آئے، البتہ وہ لونڈیاں حلال ہیں جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔

ان آیات سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز ہے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ یہ اجازت کن حالات میں دی گئی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس سے استفادہ کی کیا کیا صورتیں شارع نے تجویز کی ہیں۔

جنگ میں گرفتار ہونے والے سبایا کے حق میں اسلام نے جو قوانین وضع کیے تھے ان کو سمجھنے میں آج لوگوں کو اس لیے دقتیں پیش آ رہی ہیں کہ اس زمانے میں وہ حالات باقی نہیں رہے ہیں جن کے لئے یہ قوانین وضع کیے گئے تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیا میں اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے اور انھیں خرید و فروخت کرنے کا طریقہ رائج رہا ہے۔ اُس زمانہ میں بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ دو محارب سلطنتیں صلح کے بعد اسیران جنگ کا مبادلہ کرتیں یا ان کو فدیہ دیکر چھڑاتیں۔ زیادہ تر قاعدہ یہی تھا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوتے وہ اسی سلطنت کے قبضہ میں رہتے جس کی فوج ان کو گرفتار کرکے لے جاتی۔ اس طرح آبادیوں کے آبادیاں قید ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلی جاتی تھیں، اور کسی سلطنت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ان کثیر التعداد قیدیوں کو مقید رکھ کر ان کے کھانے کپڑے کا بار اٹھاتی۔ اس لیے سلطنتیں اپنی ضرورت کے مطابق قیدیوں کو اپنے قبضہ میں رکھتی تھیں، اور باقیوں کو فوج کے افراد میں تقسیم کر دیتی تھیں، جن کے پاس وہ لونڈی غلام بن کر رہتے تھے۔

یہ حالات تھے جن میں اسلام آیا۔ اس نے آکر پہلی مرتبہ دنیا کو یہ تعلیم دی کہ جو لوگ جنگ میں قید ہوں ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو، یا اسیران جنگ سے مبادلہ کر لو، یا بطریق احسان رہا کردو۔ لیکن اس اصلاحی تعلیم کا نفاذ تنہا مسلمانوں کے عمل سے نہ ہو سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے غیر مسلم قوموں کا راضی ہونا بھی ضروری تھا اور وہ اُس وقت اس اصلاح کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں، نہ بارہ صدیوں تک آمادہ ہوئیں۔ اس لیے اسلام نے بدرجۂ آخر اس کی اجازت دی کہ اسیران جنگ کو اسی طرح غلام بنا کر رکھا جائے جس طرح دوسری قومیں مسلمانوں کے اسیران جنگ کو رکھتی ہیں۔ مگر اس اجازت سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں ایک پست طبقہ Depressed class کا اضافہ نہ ہو جائے، جیسا کہ ہر اس قوم کے اجتماعی نظام میں ہوا ہے

جس نے دوسری قوموں کو مغلوب کیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اسیران جنگ کے ساتھ یہ معاملہ خلاف انسانیت تھا، اس سے اُن بہت سے اخلاقی و تمدنی مفاسد کے پیدا ہونے کا بھی اندیشہ تھا جو کسی نظام اجتماعی میں ایک ایسے طبقہ کی پیدائش کا لازمی نتیجہ ہیں۔ لہٰذا اسلام نے اسیران جنگ کو غلام بنا کر رکھنے کی اجازت دینے کے ساتھ ایسے قوانین بھی وضع کیے جن کا منشا یہ تھا کہ غلامی کی حالت میں جو بہتر سے بہتر سلوک ان کے ساتھ ممکن ہو وہ کیا جائے، اور ایسے اسباب مہیا کیے جائیں جن سے وہ رفتہ رفتہ اسلامی سوسائٹی میں جذب ہو جائیں۔

یہی مقصد ہے جس کے لیے لونڈیوں سے تمتع کی اجازت دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے تصور کو اب سے چند سو برس پیچھے لے جائیے۔ فرض کیجیے کہ ایک غیر قوم سے مسلمانوں کی جنگ ہوتی ہے اس میں ہزاروں عورتیں ان کے ہاتھ آتی ہیں جن میں بہت سی جوان اور خوبصورت بھی ہیں۔ فریق مخالف نہ ان کو فدیہ دے کر چھڑاتا ہے، نہ ان مسلمان عورتوں سے ان کا مبادلہ کرتا ہے جو اس کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ مسلمان ان کو بطریق احسان بھی نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ اس طرح تو ان کی عورتوں کے چھوٹنے کی کوئی امید کی ہی نہیں جا سکتی۔ ناچار ان کو اپنے ہاں رکھنا پڑتا ہے۔ اب فرمائیے کہ اتنی کثیر تعداد میں جو عورتیں دار الاسلام میں آگئی ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ ان کو دائم الحبس کر دینا ظلم ہے۔ ان کو ملک میں آزاد چھوڑ دینا گویا فسق و فجور کے جراثیم پھیلا دینا ہے۔ ان کو جہاں بھی رکھا جائے گا ان سے اخلاقی مفاسد پھیلیں گے۔ ایک طرف سوسائٹی خراب ہو گی اور دوسری طرف خود ان کی پیشانیوں پر ہمیشہ کے لیے ذلت کے داغ لگ جائیں گے۔ اسلام اس مسئلہ کو یوں حل کرتا ہے کہ انہیں افراد قوم میں تقسیم کر دیتا ہے، اور ان افراد کو ہدایت کرتا ہے کہ خبردار ان کو رنڈیاں نہ بنا دینا کہ ان سے حرام کراؤ اور ان کو آمدنی کا ذریعہ بناؤ، بلکہ یا تو خود ان کو اپنے تصرف میں لاؤ یا انہیں تو ان کے نکاح کر دو تاکہ یہ بدکاریاں اور آشنائیاں نہ کرتی پھریں۔ اس قانون کی مختلف دفعات قرآن مجید میں مختلف مقامات پر بیان کی گئی ہیں۔ سورہ نور کے چوتھے رکوع میں ہے:

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اور اپنی لونڈیوں کو جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں دنیا کی

اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ زندگی کے عارضی فائدے کی خاطر بدکاری پر مجبور نہ کرو

یہ پہلی دفعہ ہے جس نے لونڈیوں کے ایک برے مصرف کا دروازہ قطعی بند کر دیا۔ مگر یہ ان کے لیے جو خود اپنی عصمت کی حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔ رہیں وہ لونڈیاں جو خود بدکاری کی طرف مائل ہوں، تو ان کے لیے یہ حکم دیا کہ۔

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۔ (۴ : ۴)۔

پھر اگر وہ کوئی بے حیائی کا کام کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو شریف بیویوں کے لیے رکھی گئی ہے۔

اس طرح ان عورتوں کے لیے بدکاری کا بالکل سدباب کر دیا گیا خواہ مجبورانہ ہو یا رضاکارانہ مگر نفس تو وہ بھی رکھتی ہیں اور ان کے داعیات فطرت کی تکمیل بھی ضروری ہے، ورنہ ظلم بھی ہوگا۔ اور اخلاقی مفاسد کے دروازے بھی کھلیں گے۔ اس لیے ان کی نفسانی ضرورتوں کو باعزت طریقے سے پورا کرنے کی دو صورتیں تجویز کی گئیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ ان کے آقا ان کے نکاح کر دیں۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ (۲۴ : ۴)۔

تم میں جو بیوہ عورتیں ہوں ان کے نکاح کر دو اور تمہارے لونڈی غلام جو نیکوکار ہوں ان کے بھی۔

اسی طرح جو نادار لوگ زیادہ مہر دے کر معزز خاندانوں میں شادیاں کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کو بھی ترغیب دی گئی کہ تھوڑے مہر پر لونڈیوں سے نکاح کریں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴ : ۴)

اور جو شخص تم میں سے اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو وہ تمہاری مومن لونڈیوں سے نکاح کرلے۔

جب یہ صورت ہو تو خود آقا کو ان سے تمتع شہوانی کا حق باقی نہیں رہتا کیوں کہ وہ اپنی مرضی سے

یہ حق دوسرے شخص کو دے چکا ہے اور اب وہ بھی محصنات میں داخل ہو چکی ہیں جن کو نص قرآنی نے شوہر کے سوا سب کے لئے حرام کر دیا ہے۔ آیت مذکورہ کے بعد اس کی تصریح کر دی گئی ہے:۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴)	پس ان کے مالکوں کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کر دو۔ وہ قید نکاح میں لائی جائیں نہ کہ کھلی اور چھپی بدکاریاں کریں پھر جب وہ نکاح سے پابند ہو جائیں اور اس کے بعد بدکاری کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو شریف بیبیوں کے لئے ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ خود مالک ان سے تمتع کرے۔ اس کی تین شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ محض ملک یمین ہی کو قید نکاح سمجھ کر تمتع کیا جائے۔ دوسری یہ کہ لونڈی کو آزاد کر کے اس سے نکاح کیا جائے اور اس آزادی ہی کو اس کا مہر قرار دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس کو آزاد کر کے جدید مہر کے ساتھ نکاح ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اور تیسری صورت کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی فضیلت میں متعدد احادیث آئی ہیں

ایما رجل کانت عندہ ولیدۃ فعلمها فاحسن تعلیمها و ادبها فاحسن تادیبها ثم اعتقها و تزوجها فله اجران (کتاب النکاح باب اتخاذ السراری)۔	جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اس کو خوب اچھی تعلیم دے، اور اس کو اچھا ادب سکھائے پھر اس کو آزاد کرے اور اس سے نکاح کرلے تو اس کو دھرا اجر ملے گا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اعتقها ثم اصدقها۔ یعنی اس کو آزاد کر کے جدید مہر کے ساتھ نکاح کیا۔ ابو داؤد الطیالسی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے۔ جس میں حضور نے فرمایا ہے۔

اذا اعتق الرجل امته ثم امهرها مهرا جدیدا کان له اجران۔	جب کسی شخص نے اپنی لونڈی کو آزاد کیا پھر اس کو جدید مہر دے کر اس سے نکاح کیا۔ تو اس کے لیے دو اجر ہو گئے۔

خود آنحضرتؐ نے حضرت صفیہ اور جویریہ اور ریحانہ کے ساتھ اسی طرح نکاح کیا ہے کہ پہلے ان کو آزاد کیا پھر قید نکاح میں لائے۔ اس باب میں روایات مختلف ہیں آپ نے جدید مہر ادا کیا تھا۔ یا آزادی ہی کو مہر قرار دیا۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ آپ نے جواز کی دونوں صورتیں ظاہر کرنے کے لیے دونوں طریقوں پر عمل فرمایا ہے۔ بعض کو جدید مہر دیا ہے اور بعض کی آزادی ہی کو مہر قرار دیا ہے[۱]۔

رہی پہلی صورت تو وہ بھی جائز ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کی اجازت عام ہے کسی خاص صورت کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس میں بظاہر جو کراہت نظر آتی ہے وہ محض ایک وہمی کراہت ہے۔ چونکہ طبیعتیں نکاح کے عام اور معروف طریقے کی خوگر ہو چکی ہیں۔ اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ عورت اور مرد کا صرف وہی تعلق جائز ہے جس میں قاضی صاحب آئیں، دو گواہ ہوں، ایجاب و قبول ہو، خطبۂ نکاح پڑھا جائے۔ اس کے سوا جو صورت ہے وہ محض شہوت رانی ہے۔ لیکن اسلام کوئی رسمی (Conventional) مذہب نہیں بلکہ ایک عقلی (Rational) مذہب ہے وہ رسم کو نہیں حقیقت کو دیکھتا ہے۔ نکاح سے ایک عورت ایک مرد کے لئے صرف اس بنا پر حلال ہوتی ہے کہ اللہ کے قانون نے اس کو حلال کیا ہے۔ اسی طرح اگر ملک یمین کی بنا پر اللہ کا قانون اس کو حلال کرے تو اس میں کراہت کی کونسی بات ہے۔ نکاح کا مقصد انسان کے جذبۂ شہوت کو ایک حد کے اندر محدود کرنا، اور ایک ضابطہ سے منضبط کرنا، اور مرد و زن کے تعلق کو ایک باقاعدہ تمدنی تعلق کی صورت میں قائم کرنا ہے، اور

---

[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی حیات طیبہ کے آخر زمانہ میں لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اصل مقصد اسلامی سوسائٹی میں لونڈیوں کے لیے عزت کی جگہ پیدا کرنا تھا۔ اور آپ خود اپنے عمل سے مسلمانوں کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ انسانی برادری کے اس بدقسمت گروہ کے ساتھ ان کو کیسا سلوک کرنا چاہیے۔ مگر دشمنان اسلام کی بدبینی نے پیغمبر اسلام کے اس انتہائی شریفانہ فعل کو بھی نفسانیت پر محمول کر کے چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان عیب چینی پر اتر آئے تو دنیا کا کوئی نیک سے نیک فعل بھی ایسا نہیں جس میں وہ بدی کا پہلو نہ نکال سکتا ہو۔

اعلان کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشہور ہو جائے کہ فلاں عورت فلاں مرد کے لیے مختص ہو چکی ہے، اس کے بطن سے جو اولاد ہوگی وہ فلاں شخص کی ہوگی، اور اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا زوجی تعلق نہ ہوگا۔ یہ سب اغراض ملک یمین سے بھی پوری ہو جاتی ہیں، سوسائٹی میں یہ امر معلوم و مشتہر ہوتا ہے کہ فلاں لونڈی فلاں شخص کی مملوکہ ہے۔ کسی دوسرے شخص کے لیے اس لونڈی سے زوجی تعلق پیدا کرنا جائز نہیں ہوتا جب تک کہ مالک اپنی رضامندی سے اس کو نکاح کی اجازت نہ دے۔ لہٰذا لونڈی کا اپنے مالک کے ساتھ اختصاص اس صورت میں بھی قائم ہو جاتا ہے۔ وہ مالک کے تصرف میں آنے کے بعد خاندان کی ایک فرد بن جاتی ہے اس کو ام ولد کہا جاتا ہے۔ اس کی اولاد جائز اولاد سمجھی جاتی ہے، اور اپنے باپ سے شرعی ورثہ پاتی ہے۔ پھر کیا یہ نکاح کی طرح باقاعدہ زوجی تعلق نہیں ہے۔

ہاں اس طریقہ میں ایک کراہت ضرور ہے، مگر وہ ایک دوسرے پہلو سے ہے ملک یمین کی بنا پر جس لونڈی سے نکاح کیے بغیر تمتع کیا جاتا ہے، وہ اصلاً لونڈی ہی رہتی ہے۔ اس کو محصنات کے برابر مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس کی اولاد پر بھی پرستارزادگی کا داغ رہتا ہے۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضیلت اس طریقہ کو دی ہے کہ پہلے اس کو آزاد کر کے شریف عورتوں کے مرتبہ میں لے آؤ، پھر اس سے بطریق معروف نکاح کرو تاکہ اس میں عزت نفس کا وہ احساس پیدا ہو جائے جو شریف عورتوں میں ہوتا ہے، اور وہ مساویانہ حیثیت سے تمہاری سوسائٹی میں داخل ہو جائے، اور اس پر لونڈی پن کا اور اس کی اولاد پر، پرستارزادگی کا داغ نہ رہے۔

اب آپ کے صرف دو سوالوں کا جواب میرے ذمہ باقی ہے۔ ایک یہ کہ اگر مرد کو ملک یمین کی بنا پر تمتع کا حق حاصل ہے تو عورت کو یہ حق حاصل کیوں نہیں ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر غیر مسلم محاربین مسلمان عورتوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کریں تو ہم کو اس پر احتجاج کا کیا حق ہے؟ ذیل میں ان دونوں کا جواب علی الترتیب دیا جاتا ہے۔

(۱) قرآن مجید میں ملک یمین کی بنا پر تمتع کا حق صرف مردوں کو دیا گیا ہے۔ عورتوں کو نہیں دیا گیا۔ اسی لیے وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ اور دوسری تمام آیات میں خطاب صرف مردوں سے ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زوجی تعلق کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان ہمیشہ سے انسان نے امتیاز کیا ہے، اور یہ امتیاز خود اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ عورت میں عصمت کا احساس مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ عورت سے باعصمت رہنے کی توقع بھی مرد کی بہ نسبت زیادہ کی جاتی ہے اور اس کی عصمت کو مرد کی عصمت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اگر مرد بے حیائی کا فعل کرے تو اس کو اتنی بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس سے عورت کو دیکھا جاتا ہے۔ عورت کی قیمت ازالۂ بکر کے بعد آدھی رہ جاتی ہے۔ مگر مرد دس بیویاں بھی کرچکا ہو تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عورت اگر کسی غیر قوم کے مرد کے پاس چلی جاتی ہے تو اس کی ساری قوم اس کو اپنے لیے بے عزتی سمجھتی ہے لیکن مرد کا غیر قوم کی عورت سے تعلق پیدا کرنا کچھ زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہ انسانی فطرت ہے اور اس کو اسلام نے ایک حد خاص تک ملحوظ رکھا ہے مگر جب یہ چیز جہالت کی حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ اس کو پامال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ اسلام مردوں کو کتابیہ عورتوں سے نکاح کی اجازت دیتا ہے، مگر عورتوں کو اہل کتاب سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کیا ہے لیکن اگر کوئی نصرانی یا یہودی مسلمان ہو جائے تو اسلام بلا تامل اس کے ساتھ نکاح کرنے کی ہر مسلمان عورت کو اجازت دیتا ہے خواہ وہ کیسے ہی شریف گھرانے کی ہو۔ محض نومسلم ہونے کی بنا پر اس سے نکاح کو مکروہ سمجھنا اسلام کی نگاہ میں خود مکروہ ہے۔ اسی طرح وہ عورت کو اپنے غلام سے تمتع کی اجازت بھی نہیں دیتا، کیونکہ اس سے سوسائٹی میں اس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے، اور اگر وہ اس غلام سے قطع تعلق کرکے کسی شخص سے نکاح کرنا چاہے تو امید نہیں کی جاسکتی کہ کوئی مرد اس کو قبول کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ اگر عورت اپنے غلام سے تمتع کرے تو خاندان میں اس کا مرتبہ گھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے کہ عورت کو عائلی زندگی میں جو وزن حاصل ہوتا ہے وہ اس کے

شوہر کی بدولت ہوا کرتا ہے۔ اور یہاں شوہر خود غلام ہے جس کو آزاد مرد کا سا مرتبہ حاصل نہیں اس حد تک اسلام نے فطرت انسانی کی رعایت ملحوظ رکھی ہے لیکن اگر کوئی عورت اپنے غلام کو آزاد کرکے اس سے نکاح کرلے تو اسلام اس سے منع بھی نہیں کرتا کیونکہ آزاد ہونے کے بعد اس کو وضیع سمجھنا جہالت ہے۔

دوسری وجہ اور اہم تر وجہ یہ ہے کہ ملک یمین مرد کے لیے تو بمنزلہ نکاح ہو سکتا ہے۔ مگر عورت کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے عائلی زندگی کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ مرد کو عورت پر قوام ہونا چاہیے۔ اسی لیے عورت کا مہر مرد پر واجب کیا گیا ہے، اور عورت پر مرد کو اقتدار کا ایک درجہ دیا گیا ہے تاکہ وہ عورت کی خبر گیری اور حفاظت کرے، اور اپنے گھر میں وہ حاکمانہ قوت استعمال کرسکے جو خانگی زندگی کے نظام کو درست رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مصلحت عظمیٰ غلام سے تمتع کرنے کی صورت میں فوت ہو جاتی ہے۔ غلام سے عورت کا تعلق شہوت رانی کی غرض تو پوری کرسکتا ہے، مگر اسلامی نظام تمدن کے ماتحت ان دوسری اغراض کو پورا نہیں کرسکتا جن کو عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مرد غلام رہنے کی حیثیت سے عورت کا تابع فرمان ہوگا اور اسے گھر میں وہ اقتدار حاصل نہ ہوسکے گا، جو اخلاق و معاملات کی نگرانی اور نظام عائلی کو درست رکھنے کے لیے مرد ہونے کی حیثیت سے اس کو حاصل ہونا چاہیے۔

۲- اگر غیر مسلم معاہدین کے پاس ہماری عورتیں گرفتار ہوں گی تو ہم کوشش کریں گے کہ وہ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دیں، یا اپنی عورتوں کے مبادلے میں انہیں رہا کردیں لیکن اگر وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی پر بھی راضی نہ ہوئے تو ہم صبر کریں گے اور ان عورتوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب وہ کفار کے قبضہ میں ہونگی تو ان کے حق میں ہم کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ ان کا معاملہ کفار کے ساتھ ہے، اور وہ اختیار رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں ہمارا قانون صرف انہی عورتوں پر نافذ ہو سکتا ہے جو ہمارے قبضہ میں آگئی ہیں۔ اور یہ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ قید کی حالت میں اس سے بہتر سلوک کا تصور نہیں کیا جاسکتا جو اسلامی شریعت نے لونڈیوں کے لیے تجویز کیا ہے۔ کفار کا معاملہ اگر ہماری عورتوں کے ساتھ بہتر سے بہتر بھی ہوا تو اتنا ہی بہتر ہوسکتا ہے جتنا ہم انکی عورتوں کے ساتھ کرینگے، ورنہ بہرحال انکا سلوک اس سے بدتر ہوگا، اور اس پر ہم انہیں ملامت کرنے میں حق بجانب ہوں گے

ایک مسیحی بزرگ کے چند اعتراضات

"امید واثق ہے کہ ایک محقق اور طالبِ حقیقت کے ذیل کے استفسارات پر ترجمان کے توسط سے روشنی ڈالتے ہوئے نہ صرف مستفسر کو ہی بلکہ تمام ناظرین ترجمان کو بھی تشکر و امتنان کا موقع دیں گے :۔

(۱) قرآن نے مسیح کی نسبت چار وعدے ذکر کئے ہیں۔ چوتھا وعدہ ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۔(۳:۶)مسیح کے متبعین اور مسیح کے کافر دشمنوں کے وجود کا قیام قیامت تک پایا جانا اس بات کو مستلزم ہے کہ مسیح کے متبعین مسیح کے اتباع پر قائم رہیں اور اتباع کے لیے مسیح کی ہدایت اور تعلیم کا قائم اور محفوظ رکھنا اور پھر قیامت تک محفوظ رہنا ضرور ہے جس سے لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رو سے دائمی ہادی ہے۔ پس اگر یہ سچ ہے تو درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے وجود کو گھسیڑنے کے کیا معنی۔ دوسرے اسلام کا تخالف پہلی صورت مسلمہ کے منافی معلوم ہوتا ہے۔

(۲) اہل اسلام کے نزدیک اگر مسیح آسمان پر زندہ ہیں اور وہی آنے والے ہیں پیغمبر اسلام کے ظہور سے پہلے بھی وہی اور بعد میں بھی وہی، تو اس صورت میں درمیان میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ظہور کا کیا مطلب! جبکہ بغیر متبعین مسیح کا وعدہ استمرار متواصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا؟

(۳) آیت اِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكَ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۔(۱۰:۱۰)۔ اس آیت سے جب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام بھی قرآن کی وحی کے متعلق شک میں پڑ جاتے تھے تو اس صورت میں شک کو

نکالنے کے لیے آپ کو حکم ہے کہ اہل کتاب سے آپ اپنا شک نکلوا لیجیے جس سے واضح ہے کہ قرآن پیغمبر اسلام کو بھی شک میں ڈالنے والی چیز ہے اور اہل کتاب کی کتاب اور تعلیم ایسی چیز ہے کہ قرآن کے متعلق شک کرنے والے کو بھی وہی دور کرتی ہے تو اس صورت میں بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے ظہور سے اور مسیح کے بعد آنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور قرآن کریم کی نسبت تو یہ ہے مگر تورات کی نسبت لکھا ہے قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (۳: ۱۰) جس سے ظاہر ہے کہ توراۃ قابل استشہاد ہے اور وہ اس صورت میں کہ محفوظ ہو اور محرف و مبدل نہ ہو۔ اور یہ صورت بھی پہلی صورت پیش کردہ کی مؤید ثابت ہوتی ہے۔

امید ہے کہ آپ ان ہر سہ سوالات پر جن کا مآل معنی واحد ہے ایمان داری کے ساتھ خوب روشنی ڈالیں گے ورنہ آپ کی خاموشی یا غلط اور ناقابل تسلی جواب سے کئی مسلمان کہلانے والے معززاور اہل علم محقق عیسائی ہونے والے ہیں۔ اور سات اشخاص تو عیسائی ہو چکے ہیں۔ شاید آپ ابھی تک بے خبر ہی ہوں۔ حیدر آباد میں اندر ہی اندر آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور قدرت شاہ خان مشنری مسیحی کے ٹریکٹ "خط بنام مسلمانان حیدر آباد" نے کیا کچھ تہلکہ مچا دیا ہے کہ کئی خاندانوں کے خاندان عیسائی ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

آپ کا مخلص ایک محقق۔

ترجمان القرآن ۔ کاتب خط کوئی مسیحی پادری صاحب معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے مسلمان بن کر سوال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ ایک سچے عیسائی کی طرح علانیہ سامنے آ کر اعتراض کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا اور اس صورت میں بھی ان کے اعتراض کا جواب اسی محبت کے ساتھ دیا جاتا جس کے ساتھ ایک بھٹکے ہوئے مسلمان کو دیا جا سکتا ہے۔ خیر طریق اعتراض کے انتخاب میں وہ آزاد ہیں۔ ہمارا کام بہر حال ان کے اعتراض کو رفع کرنا اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

(۱) آپ نے اپنے پہلے اعتراض میں جو آیت نقل کی ہے اس میں مسیح کا انکار کرنے والوں سے مراد یہودی

ہیں۔ اور مسیح کا اتباع کرنے والوں میں نصاریٰ اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اتباع سے مراد اگر اتباع کامل یعنی ٹھیک ٹھیک قدم بقدم چلنا لیا جائے تب تو نصاریٰ اس کے مصداق نہیں رہتے، بلکہ صرف مسلمان ہی اس کے مصداق قرار پاتے ہیں اس لیے کہ نصاریٰ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے اصل الاصول کو چھوڑ دیا، اور یہودیوں کے بالمقابل ایک دوسرے طور پر ان کے ساتھ کفر کیا، بخلاف اس کے مسلمان اسی تعلیم پر قائم رہے جو حضرت عیسیٰ اور تمام دوسرے انبیا علیہم السلام نے دی ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی رسول آئے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں آئے ہوں، ان سب کی ایک ہی تعلیم تھی، اور وہ یہ تھی کہ خدائے واحد کی پرستش کرو۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ کو خدا مان لو۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (۳/۷۹)

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم خدا پرست بن جاؤ۔

اسی مقدس گروہ کے ایک فرد حضرت عیسیٰ بھی ہیں اور انہوں نے بھی کبھی عبدیت کے مقام سے بال برابر تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ (۴/۱۷۲)

مسیح نے کبھی اس کو عار نہ سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو۔

پس نصاریٰ کی تثلیث، اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف الوہیت کی نسبت اور ان کو خدا کا بیٹا کہنا دراصل حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے اور جو لوگ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں وہ آپ کے ساتھ ویسا ہی کفر کرتے ہیں، جیسا کہ یہودی کرتے ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ... لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے، درآں حالیکہ خود مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے ....

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (۵ : ۱۰) ۔ یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے

اس لحاظ سے اِتَّبَعُوْكَ کے اصلی مصداق مسلمان اور وہ عیسائی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں بلکہ اس کا رسول مانتے ہیں ان کی طرف کسی درجہ میں الوہیت کو منسوب نہیں کرتے، اور اس عقیدۂ صالحہ کے قائل ہیں کہ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (۴ : ۲۳) اور اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (۴ : ۲۳) ۔ البتہ اگر اتباع سے مراد اتباع کامل نہ لیا جائے، بلکہ فی الجملہ مسیح کو ماننا اور ان کی تعلیم کو کسی نہ کسی حد تک قبول کرنا لیا جائے، تو اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی متبعین مسیح میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اللہ کا یہ وعدہ دونوں سے متعلق ہو جاتا ہے کہ وہ ان کو یہودیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا جنہوں نے مسیح کا قطعی اور کلی انکار کیا۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ مسیح کی، اور صرف انہی کی نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور تعلیم اپنی اصل کے لحاظ سے قائم و محفوظ ہے، اور قیامت تک رہے گی۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام اس تعلیم و ہدایت کو مٹانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کو ثابت اور مستحکم کرنے اور ان آمیزشوں سے پاک کرنے آئے تھے جو انسانی اہواء اور بشری وساوس کی بدولت اس میں گھل مل گئی تھیں۔ نصاریٰ سے ان کی جنگ اس بات پر نہ تھی کہ وہ مسیح اور ان کی تعلیم و ہدایت کو کیوں مانتے ہیں، بلکہ اس بات پر تھی کہ وہ اس کو کیوں نہیں مانتے۔ انہوں نے بار بار اپنے خدا کی طرف سے فرمایا کہ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (۴ : ۲۳) اور يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵ : ۱۰) اور وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵ : ۹) ۔ اور وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (۵ : ۷) مگر جب دیکھا کہ مسیح کے متبعین سرے سے انجیل ہی کو کھو بیٹھے ہیں اور انجیل کے نام سے مسیح کی چند سوانح عمریاں لیے پھرتے ہیں جن میں مسیح کی تعلیم و ہدایت کا ایک بہت ہی خفیف حصہ اور وہ بھی آمیزش سے آلودہ پایا جاتا ہے تو انہوں نے نصاریٰ کے سامنے قرآن

پیش کیا' اور کہا کہ جو کچھ تم نے کھو دیا تھا' وہ پہلے سے بھی زیادہ مکمل صورت میں پھر تمہارے پاس آگیا۔ یہ وہی تعلیم ہے جو مسیح نے دی اور ان سے پہلے موسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ دے چکے ہیں۔ تم نے اور تم سے پہلے کی امتوں نے اس ہدایت کو بار بار گم کیا، مگر اب یہ تم کو ایسی مستحکم صورت میں دی جاتی ہے کہ قیامت تک اس کو کوئی گم نہ کر سکے گا۔ پس درحقیقت متی اور مرقس اور لوقا اور یوحنا کی کتابوں میں نہیں بلکہ قرآن میں مسیح کی اصلی تعلیم قائم اور محفوظ ہے اور وہی انشاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔

آپ کا یہ قول بھی محل نظر ہے کہ آیت زیر بحث سے "لازم آتا ہے کہ مسیح ہی قیامت تک اپنی تعلیم اور ہدایت دائمی کی رو سے دائمی ہادی ہے۔ یہ مفہوم آپ کے تخیل کا پیدا کردہ ہے۔ آیت کے الفاظ آپ کی دلالت نہیں کرتے وہاں تو صرف اس قدر کہا گیا ہے کہ جو تیرا انکار کرتے ہیں' ان پر ہم تیرا اتباع کرنے والوں کو قیامت تک غالب رکھیں گے۔ ان الفاظ سے یہ معنی کیونکر نکالے جا سکتے ہیں کہ اب تو ہی دائمی ہادی ہے اور تیرے بعد بھی ہدایت پیش کرنے کے لیے کوئی اور نبی نہ بھیجا جائے گا۔ افسوس کہ آیات کتاب میں لفظی و معنوی تحریفات کرنے کی پرانی عادت ہمارے مسیحی بھائیوں میں سے ابھی تک نہیں گئی۔

(۲) مسیح کے بعد پیغمبر اسلام کے ظہور کا مطلب آپ ہم سے پوچھنے کے بجائے خود مسیح علیہ السلام سے پوچھیے جن کا یہ ارشاد تمام تحریفات کے باوجود کتاب یوحنا میں اب تک موجود ہے:۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (تسلی دہندہ یا وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" (یوحنا ۱۶: ۷ - ۸)۔

اور یہ کہ:۔

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی

سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا ۱۵: ۲۶)۔

اور یہ کہ:۔

"لیکن مددگار یعنی سچائی کی روح جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا ۱۴: ۲۶)۔

اور یہ کہ:۔

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا۔ کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" (۱۴: ۳۰)۔

اور یہ کہ:۔

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا۔ تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آیندہ کی خبریں دیگا۔ (۱۶: ۱۲: ۱۳)۔

اس سے آپ پیغمبر اسلام کے ظہور کا مطلب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ "غلبہ متبعین مسیح کا وعدہ" جو استمرار بلا فصل کے معنوں میں قیامت تک کے لیے پیش کیا گیا ہے" پیغمبر اسلام کے ظہور سے ٹوٹتا نہیں، بلکہ اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے، کیونکہ پیغمبر اسلام نے آکر مسیح کی گواہی دی (اِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ اور وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ) اور اس بہتان عظیم پر یہودیوں کو توبیخ کی جو وہ ان کی ماں پر رکھتے تھے (وَ بِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا) اور وہ ... تیں سچوں کو یاد دلائیں جو مسیح نے ان سے کہی تھیں (وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ فِيهِ) مسیح اسی لیے گئے تھے کہ اس دوسرے آنے والے کے لیے جگہ خالی کر دیں جو ان کے بعد آکر اس کام کو پورا کرنے والا تھا جسے وہ نامکمل چھوڑ گئے تھے۔

(۳) آیت اِنْ کُنْتَ فِیْ شَكٍّ الخ میں اگرچہ خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف معلوم ہوتا ہے، مگر دراصل تمام لوگ اس کے مخاطب ہیں مقصد اس آیت کا یہ ہے کہ اے مخاطب اگر تجھے قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو جن لوگوں کے پاس قرآن سے پہلے آئی ہوئی کتابیں موجود ہیں ان سے دریافت کرلے۔ ان کی گواہی سے تجھکو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اشارہ ہے ان پیش گوئیوں کی طرف جو انبیاء سابقین کی کتابوں میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق موجود ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے، مثلاً ۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا — جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے
یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ — ہیں جیسا کہ وہ خود اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، مگر ان میں سے
لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ (۲: ۱۷) — ایک گروہ جانتے بوجھتے سچی بات کو چھپاتا ہے۔
وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ — اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن
مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (۶: ۱۴) — درحقیقت تیرے پروردگار کی طرف سے اترا ہوا ہے۔

قرآن نے اپنی صداقت پر منجملہ بہت سی شہادتوں کے ایک شہادت انبیاء سابقین کی کتابوں سے بھی پیش کی ہے، اور اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ بالخصوص ان لوگوں کو مطمئن کرنا مقصود ہے جو انبیاء سابقین کی کتابوں کو مانتے ہیں مگر قرآن کی صداقت میں شک کرتے ہیں، اس لیے کہ کتب سابقہ کی گواہی انہی کے لیے معتبر ہو سکتی ہے۔ اس طلب شہادت میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہو کہ قرآن شک میں ڈالنے والی چیز ہے۔ بات کو اس کے صاف اور واضح مفہوم سے پھیر کر پیچیدہ مطالب نکالنے کی کوشش کرنا کسی طالب حق کا کام نہیں، ان طریقوں کو ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیجیے جو نزاع و جدال کی الجھنوں میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ سے پہلے ایک اور فقرہ تھا

جس کو آپ نے دانستہ یا نادانستہ چھوڑ دیا۔ پوری آیت یہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (۳: ۱۰۰)

تمام کھانے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے بجز اُن کے جنہیں اسرائیل نے توراۃ کے نزول سے پہلے اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔ اے محمد کہو کہ توراۃ لے آؤ اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔

اس آیت میں یہود کو یہ الزام دیا گیا ہے کہ تم توراۃ کے احکام کو چھپاتے ہو، اور یہ الزام ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِندَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ۔ (۵: ۷)

وہ تجھ کو اپنے معاملہ میں کیسے حکم بنائیں جب کہ خود اُن کے پاس توراۃ موجود ہے جس میں اللہ کا حکم ہے اور پھر وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ دراصل توراۃ پر بھی ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

قرآن میں یہودیوں کے دو جرم بتائے گئے ہیں۔ ایک جرم یہ ہے کہ وہ کتاب میں تحریف کرتے ہیں دوسرے یہ کہ تحریفات کے باوجود جو کچھ کتاب میں سچی خدائی تعلیم باقی ہے، اس کو بھی اپنی خواہشات نفس کے اتباع میں چھپاتے، اور اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ یہاں اگر توراۃ سے استشہاد ہے تو وہ یہودیوں کے جرم کتمان پر ہے اس سے آپ کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سیز ۴۸۶ **فضل فونٹن پن** جونیئر ۱۱۰

نیا اسٹاک آچکا ہے۔ خوبصورت پائیدار قیمت واجبی علاوہ اس کے سامان اسٹیشنری و کاغذ وغیرہ خط و کتابت سے طلب فرمائیے۔

فدا علی محمد علی تاجر کاغذ وغیرہ پتھر گٹی حیدرآباد دکن

مسائل ایصال ثواب و زیارت قبور وغیرہ

محبوب نگر سے ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

"ایک عرصہ سے دل میں شبہ اور خلش تھی کہ مندرجۂ ذیل مسائل کے متعلق قرآنی رہنمائی پاؤں، مگر کوئی تشفی بخش جوابات نہیں ملے۔ لیکن آپ کی فاضل شخصیت سے امید ہے کہ بذریعۂ احادیث و قرآن کریم اس کے جواز و عدم جواز کے متعلق رہبری فرمائیں گے۔

(۱) ایصال ثواب کے متعلق ہم کو کیا احکام ہیں؟

(۲) بزرگان دین کے وسیلہ سے دعا مانگنا کس حد تک روا ہے؟

(۳) بزرگان دین کی قبور کی زیارت کرنا۔

(۴) ہر سال درگاہوں پر عرس اور میلوں کا ہونا۔

قرآن کریم اور احادیث شریفہ کے احکام اس کے متعلق کیا ہیں؟ میں حنفی مذہب رکھتا ہوں لیکن دل میں شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ براہ کرم بذریعہ رسالہ اس کی اشاعت ہو تو مجھ جیسے دوسرے بھائیوں کے خیالات بھی درست ہو جائیں گے۔"

ترجمان القرآن۔ یہ مسائل جزئیات فقہ سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ مناسب ہوتا کہ ان کے متعلق کسی فقیہہ اور مفتی سے سوال کیا جاتا۔ اس رسالہ کے دائرۂ بحث کو زیادہ تر کلیات اور اصول دین کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، اور مناسب یہی ہے کہ اس کو اسی دائرے میں رہنے دیا جائے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ایصال ثواب اور زیارت قبور اور ایسے ہی دوسرے مسائل کو تنگ نظ

حضرات نے اس قدر اہمیت دے دی ہے کہ اصول دین اور فرائض و ارکان کی اہمیت بھی ان کے مقابلہ میں دب گئی ہے، حتیٰ کہ انہی امور پر دل کھول کر انہوں نے ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کی ہے، درانحالیکہ ان چھوٹے چھوٹے مسائل میں مخالف یا موافق کوئی رائے رکھنے اور اس کو بیان کر دینے سے دین میں بال برابر بھی رخنہ نہیں پڑتا۔ یہ ساری اہمیت جو ان مسائل کو حاصل ہوئی ہے، اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو چکی ہیں، بلندی خیال اور وسعت نظر اور اولوالعزمی نے ان کے دل و دماغ کو چھوڑ کر دوسروں کے قلوب و اذہان میں آشیانہ بنالیا ہے۔ اب یہ اس قابل تو رہے نہیں کہ آفاق اور انفس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ اور ان پر غور و فکر کر سکیں، نہ ان میں یہ قابلیت رہی کہ زمین و آسمان کی جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے ان کیلئے مسخر کیا ہے ان سے کام لیں۔ نہ ان میں وہ عظیم الشان خدمات انجام دینے کی صلاحیت باقی رہی جن کے لیے ان کو خیر امۃ اور امۃ وسطا اور شہداء علی الناس کہا گیا تھا، نہ ان کے اندر وہ حوصلے اور عزائم ہی باقی رہے ہیں جن کے لیے زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی تھی۔ یہ سب ان کے اسلاف کر چکے، اور ان کے لیے بجز اس کے اور کوئی کام رہا ہی نہیں کہ زیارت قبور اور ایصال ثواب اور عرس و فاتحہ کے مسائل پر غور و فکر اور تحقیق و اجتہاد کی قوتوں کو صرف کریں، اور دین و دنیا کی فلاح کو انہی کے تصفیہ پر منحصر سمجھیں۔ جب تک دنیا اور دین کے بڑے بڑے معاملات اور اہم مسائل مسلمانوں کے پیش نظر رہے، انہوں نے کبھی ایسے حقیر جزئیات کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اس زمانہ میں شائد کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہی نہ ہوا کہ ارواح موتیٰ کو ثواب پہنچایا جائے یا نہیں اور پہنچایا جائے تو کس طرح؟ نہ اس وقت ان کو اتنی فرصت تھی کہ بزرگوں کی وفات کی تاریخیں نوٹ کر کے رکھیں اور ان مقررہ تاریخوں کے آنے سے ہفتوں پہلے شرکت عرس کی تیاریاں کریں اور سب کام چھوڑ کر ٹھیک وقت پر ان کی قبور پر جمع ہو جائیں۔

مگر اب کہ مسلمان سب کرنے کے کاموں سے فارغ ہو چکے ہیں، جو کچھ غور طلب تھا اس پر غور کر لیا، جو کچھ